قطعاتِ حالیؔ : مابعدنوآبادیاتی تعبیر

Post- colonial interpretation of qataat'e Hali

[1] حمیرا اکرم [2] ڈاکٹر لیاقت علی

Abstract:

The multi-faceted post-colonial studies that have given a new perspective to the colonial and post-colonial literature of India have led to a long series of new interpretations and analysis of art. These include finding out the truth, tracing colonial tactics which were devised for the justification of the establishment of British rule in India. Being a victim of contemporary subjectivity, it was not possible for the artist of this era to consciously analyse cultural and intellectual changes, although his subconscious is an awarded of these changes and expressed them in his own way. The post-colonial interpretation of a few passages from Khawaja Altaf Hussain Hali's voluminous poetic collections will trace the perception of the intellectual and social changes of this era.

Keywords: Interpretation, Post-colonial Study, European narratives, perspective.

کثیرالجہات مابعد نوآبادیاتی مطالعات نے ہندوستان کے نوآبادیاتی اور پسِ نوآبادیاتی عہد کے ادب کو نئے زاویوں سے دیکھنے کے جو تناظرات بخشے ہیں ان سے فن پاروں کی نئی تعبیر اور تجزیہ کرنے کا ایک طویل سلسلہ چل نکلا ہے۔ ان مطالعات میں اس عہد کے یورپی بیانیوں کی حقیقت جاننا، استعماری ہتھکنڈوں کا سراغ لگانا اور ہندوستان میں برطانوی راج کے قیام کی توجیہات اور جواز کی قلعی کھولنا بھی شامل ہیں۔ عصرِ حاضر کی موضوعیت کا شکار ہونے کی بنا پر اس عہد کے فنکار کے لیے ثقافتی اور فکری تبدیلیوں کا شعوری تجزیہ کرنا ممکن نہیں تھا ۔ لیکن اس کا لاشعور ان تبدیلیوں کا ادراک بھی کر رہا تھا اور اپنے اپنے انداز سے اس کا اظہار بھی۔ اس تناظر سے خواجہ الطاف حسین حالیؔ کے ضخیم کلام میں سے چند قطعات کی مابعد نوآبادیاتی تعبیر کرتے ہوئے اس عہد کی فکری و سماجی تبدیلیوں کے ادراک کا سراغ لگایا جائے گا۔

کلیدی الفاظ: تعبیر، مابعد نوآبادیاتی مطالعہ، یورپی بیانیے، تناظر، الطاف حسین حالی

عصرِ حاضر میں متن کی تشریح، توضیح اور تفہیم و تعبیر باقاعدہ ایک فلسفہ بن چکی ہے۔ تعبیریت/ تفہیمیت (Hermeneutics) کو بطور فلسفہ Freidrich Schlieir Marchr نے اہم کردار ادا کیا۔ جس نے متن کی تعبیر کے لیے تین مراحل کا ذکر کیا۔ تاریخ کی روایت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پہلے مرحلے میں متن کے کلی مفہوم کا اندازہ لگانا، دوسرے مرحلے میں کل کے تعلق میں اجزا کا تجزیہ کرنا اور تیسرے مرحلے میں دوسرے مرحلے کے نتائج کی مدد سے پہلے مرحلے میں قائم کیے گئے تصور کی تصدیق و ترمیم کرنا ہے۔[1] ان اصولوں کو خصوصاً تاریخ کی روایت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خواجہ الطاف حسین حالیؔ کے چند قطعات کی تعبیر کی گئی ہے۔ تاریخ

[1] اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین، دوبئی محل، بہاول پور
[2] ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور

کا یہ عہد نو آبادیاتی عہد کہلاتا ہے، جس میں ہندوستان کے تمام طول و عرض میں برطانوی نو آبادکار اپنے استعماری مقاصد کے پیشِ نظر تمام افکار، نظریات، افعال اور کردار وضع اور لاگو کر رہے تھے۔ اصطلاحاً اُن سب کا مطالعہ مابعد نو آبادیاتی مطالعہ کہلاتا ہے۔ لہٰذا ان قطعات کی مابعد نو آبادیاتی تعبیر کی گئی ہے۔

قطعہ بہ عنوان ''بدی کر کے نیک نامی کی توقع رکھنی'' گہری معنویت کا حامل ہے۔ بدی کرنا اور توقع رکھنا کہ اس سے نیک نامی اور شہرت ہو گی، تو یہ خلافِ فطرت بات ہے۔ حالیؔ بیان کرتے ہیں کہ ایک ظالم اور سفاک حاکم کسی ضلع کے لوگوں سے ازراہِ شرارت جا کر یہ پوچھتا ہے کہ لوگ ہماری تعریف کرتے ہیں یا مذمت، اس کی مثال حالیؔ نے یوں دی ہے کہ جیسے کوئی بری آواز والا شخص اپنی اس بری آواز سے آگاہی کے باوجود گا کر اور پھر خود ہی اپنی آواز کے پیچھے لپک کر جائے اور سننے کی کوشش کرے کہ اس کی یہ آواز اچھی ہے یا بری۔ بظاہر قطعے کا آغاز زیادہ چونکا دینے والا نہیں۔ ''نامنصف و بے رحم حاکم کہ جس کے برتاؤ سے رعیت بہت نالاں تھی'' اس طرح سے شروع ہونے والی حکایات کا چلن ہمیشہ سے یہاں رہا ہے، بادشاہوں کے اعمال و کردار کے حوالے سے حکایات کا مقصد اخلاقی سبق ہوتا ہے لیکن اس قطعہ کا یہ شعر ایک مخصوص پس منظر کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو نو آبادیاتی نظام سے عبارت ہے۔

نو آبادکار اپنے استعماری ہتھکنڈوں کو کامیاب کرانے کے لیے جن وسائل کو بروئے کار لا رہا تھا ان میں سے ایک عوامی رائے سے آگاہی حاصل کرنا تھا، جو اس شخص کی مانند تھا جو اپنی آواز کی بدصورتی سے بہ خوبی آگاہ تھا لیکن وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ دوسرے اس کو کیسا سمجھتے ہیں۔ نو آبادکار کے اپنے تمام اعمال و افعال کے ردعمل کو جاننے کے لیے کرائے گئے مختلف سروے اور خصوصاً مقامی اخبارات کا فروغ اس کی اہم کڑی تھا۔ امداد صابری کے مطابق ۱۸۲۲ء سے ۱۸۵۷ء تک ۴۵ اردو اخبارات نکل رہے تھے جبکہ کراچی یونی ورسٹی کے شعبۂ صحافت کے ڈاکٹر طاہر مسعود نے اپنی تحقیق میں یہ تعداد ۱۲۲ بتائی ہے۔[2] اسی طرح رائے عامہ Public Opinion کا تصور نو آبادکار کے ساتھ وارد ہوا تھا۔ آزادیٔ رائے کے اس بظاہر کشادہ رویے کے پس منظر میں نو آبادکار کا تجسس تھا جو مقامی باشندوں کی آرا کو جاننے کی خواہش کا زائیدہ تھا۔ اس جانکاری کا مقصد نو آبادیاتی

منصوبے کے قیام واستحکام کی پالیسیوں کو بہتر کرنے کے لیے مقامی باشندوں کی آرا کا جاننا تھا۔

''جس قوم میں افلاس ہو اس میں بخل اتنا بند نما نہیں جتنا اسراف'' حالیؔ کا یہ قطعہ اجتہادی فکر کا حامل ہے۔ اجتہاد ان معنوں میں کہ اخلاقی تقاضے بھی بعض اوقات وقت کی نزاکت کے تحت بدل دیے جاتے ہیں۔ جس کی بڑی مثال خلیفۂ دوم حضرت عمر کا قحط کے دنوں میں چوری کرنے کی سزا کا ختم کرنا تھا۔ حالیؔ بھی بخل کے مقابلے میں اسراف کی مذمت کرنے کو اسلاف کے رویوں کے برعکس سمجھتے ہیں اس لیے اس مذمت کی وجہ بھی بیان کرتے ہیں۔ جس معاشی بحران کے پیشِ نظر رعایا کے خلاف خلیفۂ وقت کو چوری کی سزا ملتوی کرنا پڑی تھی، حالیؔ کا عہد بھی اسی طرح کے معاشی بحران کا شکار تھا۔ یہ بحران فطری نہیں تھا اور نہ ہی حالات کے سادہ اور منطقی طریقے سے چلنے سے پیدا ہوا تھا۔ یہ بحران ظالمانہ اور غاصبانہ اعمال سے پیدا شدہ تھا۔ اس لیے حالیؔ اپنی اس منطق کی وجہ ''روکے'' یعنی روتے ہوئے بیان کرتے ہیں۔ یہ رونا بے بسی سے پیدا شدہ ہے، جب وقت کے جبر کی بنا پر حالیؔ کو بخل کی بجائے اسراف کی مذمت کرنا پڑی کیونکہ ہندوستان جیسی عظیم ریاست کی جو حالت ہو چکی تھی اس کو وہ یوں بیان کرتے ہیں:

اور اب کے نہ دولت ہے نہ ثروت ہے نہ اقبال — گھر گھر پہ ہے چھایا ہوا افلاس و فلاکت
ترغیب سخاوت کی ہے اب قوم کو ایسی — پرواز کی ہے چیونٹیوں کو جیسے ہدایت

''اور اب کے'' یعنی حالیؔ کے معاصر عہد میں دولت، ثروت اور اقبال کے ختم ہونے اور گھر گھر افلاس و فلاکت کے چھانے کے پس منظر میں نوآبادکار کے حریص افعال اور غاصبانہ اعمال مکمل طور پر اجاگر ہو جاتے ہیں کہ کس طرح برطانیہ کی خوش حالیؔ کے لیے لاکھوں ہندوستانیوں کی بلی چڑھائی گئی۔ اس سب کے اثرات معاشرے پر قحط کی انتہائی دردناک صورت میں ظاہر ہو رہے تھے۔

معاشی اور اقتصادی ماہرین کے نزدیک جمہوریت اور آزاد پریس کے ہوتے ہوئے کبھی قحط نہیں پڑ سکتا۔ ہندوستان میں قحط کی وجہ خوراک کی قلت نہیں تھی بلکہ عوام کی خوراک تک رسائی نہ ہونا تھی۔ اُس وقت موثر تقسیم ہی قحط کا توڑ ہو سکتی تھی لیکن اس کے برعکس برطانوی پالیسیاں اس صورتِ حال سے ہر طرح کا فائدہ

اٹھانے کے لیے وضع کی جارہی تھی۔ جس وقت لاکھوں لوگ یہاں بھوکوں مر رہے تھے، اس وقت لاکھوں ٹن گندم ہندوستان سے برآمد کی جارہی تھی۔ یہ اصل حقیقت تھی برطانوی جمہوریت کی کہ جس کی وجہ سے تاجِ برطانیہ کے زیرِ سایہ ساڑھے تین کروڑ کے قریب ہندوستانی ناحق فاقوں سے مارے گئے۔ ششی تھرور اسے ''نوآبادیاتی ہالوکاسٹ'' کا نام دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''یوں تو انسانی اموات کا تقابل ہمیشہ سے تکلیف دہ ہوتا ہے (برطانوی) راج کے دوران قحط اور وباؤں سے مارے گئے تین کروڑ پچاس لاکھ ان کی یاد دلاتے ہیں جو دو کروڑ پچاس لاکھ سٹالن کی اجتماعیت کی تحریک اور سیاسی تزکیہ میں مارے گئے، ان چار کروڑ پچاس لاکھ کی جو ماؤ کے تمدنی انقلاب کے دوران مارے گئے اور ان پانچ کروڑ پچاس لاکھ کی جو جنگ عظیم دوم کے دوران پوری دنیا میں مارے گئے۔ نوآبادیاتی ہالوکاسٹ کی اموات کی شرح موجودہ دور میں، انسان کے انسان کے ساتھ غیر انسانی سلوک کی چند اذیت ناک مثالوں کے ساتھ، ابھی بھی وہیں پر ہے''[3]

قحط کی درج بالا صورتِ حال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے حالیؔ کے قطعہ ''طبیب اپنے بیماروں کے مرنے پر مغموم کیوں نہیں ہوتے'' کا مطالعہ کریں تو معنی کا تسلسل اس پورے منظر نامے کو واضح کر دیتا ہے۔ طبیبوں کا اپنے مریضوں کی موت پر مغموم نہ ہونا، اس کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں مثلاً سب سے پہلے موت کی اٹل حقیقت کا جس شدت سے احساس اطبا کو آئے روز کے تجربوں کی بنا پر ہوتا ہے، عموماً دوسرے لوگوں کو نہیں ہوتا۔ دوسرا شفا اور زندگی دونوں کا رب کی عطا ہونے کا یقین بھی دیگر لوگوں کی نسبت ان میں زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ انتہائی مہلک حالت میں معجزانہ طور پر کسی کے بچنے اور بعض اوقات کسی معمولی وجہ سے کسی کے مرنے کے تجربے کے وہ اس قدر عادی ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا کسی کی زندگی بچ جانے پر اپنی قابلیت کا یقین اور کسی کے مرنے پر انھیں اپنی کوتاہی کا احساس کم ہی ہوتا ہے۔ لیکن حالیؔ کسی طبیب کے مغموم ہونے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس کو یہ ڈر ہوتا ہے کہ کہیں مجھے ہی موردِ الزام نہ ٹھہرایا جائے۔ حالیؔ جیسے دانشور کا اس موضوع پر قلم اٹھانا اتنے سرسری معنی کی خاطر نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ان کی سوچ اس قدر منفی یا تنگ تھی کہ وہ ایسی صورتِ حال کی وجہ کسی طبیب کی کم

ظرفی کو قرار دیتے۔اس کا مطلب ان کے لاشعور میں کچھ اور ہے۔

ہندوستان میں اتنے بڑے پیمانے پر قحط اور ان سے جاں بحق ہونے والے افراد کی شرحِ اموات اور پھر قحط کے اسباب، اس سارے منظر نامے میں کون سی ایسی بات تھی جس کی بنا پر قومی اور بین الاقوامی سطح پر تشویش کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ یہ تشویش ان معنوں میں کہ ہندوستان جو ماضی کی انتہائی خوشحال ترین مملکت تھی، آج ایسی کون سی آفت نازل ہو گئی ہی کہ لوگوں کی اموات اتنے بڑے پیمانے پر ہو رہی ہیں۔اس وقت اس تناظر سے ایسا نہ سوچنا بہت سے سوالوں کو جنم دیتا ہے، لیکن جن کے جواب اس وقت کی نسبت آج بہ آسانی دیے جا سکتے ہیں۔اس قطعے میں اگر طبیب، نوآبادکار کو اور مرنے والے مریض ان ہندوستانی باشندوں کو سمجھ لیا جائے جو قحط سے ہلاک ہوئے تو نوآبادکار کا ان مرنے والوں پر مغموم نہ ہونا سمجھ میں آ سکتا ہے۔اس کی دو بڑی وجوہ یہ تھی:

۱۔ قحط کی اصل وجہ خود نوآبادکار کے ہاتھوں ہندوستان کا معاشی استحصال تھا۔

۲۔ صنعتوں کو تباہ کر کے، محصولات کو بڑھا کر عوام کی معاشی حالت اس قدر ابتر کر دی تھی کہ اناج کی کمی نہ ہونے کے باوجود، عوام اپنی قوتِ خرید ختم ہونے کی وجہ سے اناج سے محروم ہو چکے تھے

اس معاشی قتل کے ذمہ دار خود کیسے مغموم ہو سکتے ہیں۔انہوں نے تو اس کے برخلاف نہ صرف سب کی توجہ ہٹائی بلکہ ساری صورتحال سے اپنے حکومتی استحکام کے جواز کو مضبوط اور اپنی استعماریت کو ہندوستان کے لیے غیبی امداد ثابت کر دیا۔ایسے مشکل حالات میں اپنے خلوص کے اظہار کے طور پر انھوں نے کئی سروے کرائے، رپورٹیں مرتب کیں جس میں اسی قحط کے ذمہ دار بڑھتی ہوئی آبادی، گھٹتی ہوئی چاول کی پیداوار، آب وہوا کا کردار، دیسی بود و باش اور ٹرانسپورٹیشن کی کمی وغیرہ کو قرار دے کر عوام کو اس طرح الجھا دیا، کہ وہ اس ساری صورتِ حال کو پیدا کرنے والے حقیقی عناصر کو جان ہی نہ سکے۔ بلکہ اس مہربان برطانوی انتظامیہ کی قابلِ ستائش کوششوں کی بنا پر ان کے احسان مند ہو گئے۔اس احسان مندی کے جذبات کو مزید تقویت نوآبادکاروں کہ ان بیانیوں سے ملی جس میں انھوں نے اس مشکل گھڑی میں، ایسے ملک میں اپنی حکومت

کے وجود کو غیبی امداد متصور کرادیا۔ یوں نو آبادکار نے دہرا فائدہ اٹھایا؛ ایک مالی اور دوسرا اخلاقی۔ نو آبادکار اِس حربے سے عزت بھی ملی اور ان کے گھروں میں گھی کے چراغ بھی جلنے لگے۔ ایسی صورت میں طبیب کو کیا پڑی کہ وہ بیمار کے مرنے پر سب کچھ چھوڑ کر مغموم ہوتا پھرے۔

''چھوٹوں کا بڑا بن جانا'' اس قطعہ میں حالیؔ حکایت والے انداز میں بتاتے ہیں کہ ایک دانا نے چند بڑی چھوٹی لکیریں کھینچ کر لوگوں سے کہا کہ کوئی ایسا ہے کہ ہاتھ لگائے بغیر چھوٹی لکیروں کو بڑا کر دکھائے۔ ایک شخص نے اٹھ کر سب بڑی لکیروں کو مٹا دیا اور یوں چھوٹی لکیریں خود بخود بڑی ہو گئیں۔ اس حکایت کے بعد حالیؔ کہتے ہیں کہ قوم کے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے نا ہونے سے حالیؔ اور دوسرے خود بخود بڑے بن بیٹھے ہیں۔

شعر میں تھے استاد اکثر سحر بیاں اور نکتہ سرا
لے گئی ان کو آخر کار بحر فنا کی موج بہا

کسی بھی شخص کی زندگی کا کسی وقت ختم ہونا مقدر کی بات ہے لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایک ہی ہلے میں بحر کی موج کی طرح موت آئے اور سب کو بہا لے جائے۔ حالیؔ جس عہد میں سانس لے رہے تھے ہندوستان کا سماج اس وقت استعمار کی زد پہ تھا۔ مختلف چیزیں اور رویے غیر فطری انداز میں ایک دوسرے کی جگہ لے رہے تھے۔ علمی، فکری، معاشی یا سیاسی کسی بھی حوالے سے کسی چھوٹے کا اپنے مسلسل علم و عمل کی بدولت خود کو بتدریج بڑا کر لینا کسی بھی معاشرے میں کوئی اچھنبے کی بات نہیں لیکن یکلخت چھوٹوں کا بڑا بن جانا نہ تو فطری ہوتا ہے اور نہ منطقی، اس کی ایک ہی صورت ہے جس میں بڑوں کو ختم کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے، نو آبادکار نے ایسا ہی کیا۔ ہندوستان میں بڑوں کا ختم ہونا ہمیں دو طرح سے نظر آتا ہے۔ دو اقتباسات دیکھیے:۔

> ''غالب نے جس علمی روایت اور جس فکری فضا میں پرورش پائی تھی اس کے زمانے میں ہماری تہذیب کا فلسفیانہ مزاج جس طرح کے سوالوں سے آشنا تھا ان کو جاننے والے اور سمجھنے والے ایک ایک کر کے پھانسیوں پر لٹکا دیے گئے، گولیوں کا نشانہ بنے یا انڈمان بھیج دیے گئے تھے۔ تہذیبی قتلِ عام نے ایک پوری نسل کا خاتمہ کر دیا۔ ایک نسل ختم ہوئی،

ایک زمانہ ختم ہوا ایک تہذیب ختم ہوئی، لیکن بڑا حادثہ یہ ہوا کہ اس تہذیب کو اسی تہذیب کے دیے ہوئے علم کی روشنی میں پہچاننے والے بھی ختم ہوئے۔''[4]

''۔۔۔۱۸۱۸ء میں صوبہ بنگال میں ایک قانون نافذ ہوا جس کی رو سے تمام لاخراج زمینیں، جو مغل سلاطین نے عطا کی تھیں، ضبط کر لی گئیں۔ اس وقت صوبہ بنگالہ میں پچانوے فیصد مسلمان ان زمینوں کے مالک تھے۔ اس قانون کے نفاذ کے بعد ان کی تعداد پانچ فیصد رہ گئی۔ پھر اٹھارہ سال بعد ایک اور قانون نافذ ہوا جس نے مسلمانوں کی حیات قومی پر سخت ضرب لگائی۔ یعنی فارسی اور اردو کو دفتر و دربار سے خارج کیا گیا۔ اس وقت تک تمام معمولی حکام، دیوان، مفتی، قاضی، صدر اعلیٰ، صدر امین اور کوتوال کے علاوہ محرر و کلرک اور نقل نویس سب کے سب مسلمان ہوتے تھے۔ اس قانون سے دفعتاً یہ سب عہدے ان کے ہاتھوں سے نکل گئے۔''[5]

اقتدار تو چھن ہی چکا تھا لیکن مسلمانوں سے ان کی علمی اور مالی قدآوری چھین کر ان سے کہیں چھوٹے بونوں کو ''بڑا'' کر دیا گیا۔

قطعہ ''انسان جو اشرف المخلوقات ہے، سب سے زیادہ موردِ آفات ہے'' کے پہلے تین اشعار میں حالیؔ بیان کرتے ہیں کہ انسان کو تکلیف دینے والی تمام باتوں میں سے دو باتیں زیادہ تکلیف دہ ہیں۔ ایک یہ کہ آنے والے وقت کا خوف جس نے آ کر ہی رہنا ہو، اور دوسرا لوگوں کے منہ سے نکلی وہ باتیں جن کا وار تلوار سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ ان دو باتوں کے علاوہ ''حیوانِ ناطق'' پر بہت سے دوسرے مصائب بھی آتے ہیں۔ اس کے بعد حالیؔ کہتے ہیں:

پر گدھے اور اَور حیوانات سب رہتے ہیں دور ان گزندوں سے سدا
کیسا ان آلام سے رہتا نچنت اشرف المخلوق اگر ہوتا گدھا

حالیؔ کی فطری انکساری اپنی جگہ لیکن موازنے کا یہ انداز کسی انکساری کا نتیجہ نہیں اور نہ ہی اشرف المخلوق کو مفروضاً گدھا کہنا عقل و دانش کا تقاضا ہے۔ ایسا موازنہ یا مفروضہ شدید تکلیف میں کیا گیا ایسا طنز

محسوس ہوتا ہے جو انسانی اذیت اور تکلیف کو محسوس کرنے کے بعد حالات کی ستم ظریفی پر کیا گیا ہے یا پھر اس شخص پر جو انسان اور حیوان میں تمیز کیے بغیر لفظوں کے نشتر چلا رہا ہو۔ ''حیوانِ ناطق'' کی ترکیب نوآبادیاتی عہد کی زائیدہ معلوم ہوتی ہے جب یورپی نوآبادکار نسلی برتری کے احساس سے اپنی نوآبادی کے باشندوں کو کمتر ہونے کا احساس دلا رہے تھے۔۔ جس کے نتیجے میں اعلیٰ اور ادنیٰ، برتر اور کمتر، انسان اور حیوان کی ثنویت جنم لے رہی تھی۔ فرانتز فینن کے مطابق نوآبادیاتی نظام کی بنیاد ''مانویت'' کے اصول پر رکھی جاتی ہے، جس میں دو متخالف اور متضاد اشیا، رویے اور خصوصیات فوقیتی ترتیب کے نکتہ نظر سے لائے جاتے ہیں:۔

> ''بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ مانویت اپنے منطقی نتائج تک پہنچ جاتی ہے اور مقامی باشندوں کو انسانیت سے خارج کر دیتی ہے۔ زیادہ واضح لفظوں میں یوں کہیے کہ انہیں جانور بنا دیتی ہے۔ فی الحقیقت وہ اصطلاحیں جو نوآبادکار استعمال کرتا ہے وہ حیوانات کی اصطلاحیں ہوتی ہیں۔''[6]

اس پس منظر میں حالیؔ کے اس طنز کا نشانہ وہ نوآبادکار ہے جس کے ہاتھوں مقامی باشندہ تکلیف بھی سہ رہا تھا اور جانور بھی سمجھا جا رہا تھا۔ اشرف المخلوق کی ایسی تذلیل پر حالیؔ جیسا متحمل انسان بھی تکلیف میں کہہ اٹھا کہ کاش انسان (اشرف المخلوق) حقیقتاً گدھا ہی ہوتا کہ جو ان اذیتوں سے محفوظ ہوتا۔

شائستہ لوگوں کا برتاؤ سائل کے ساتھ ''نوآبادکار کا اپنی زبان، اپنی ثقافت اور اپنے علم و ادب کو مہذب کہنے کے جواز کے طور پر پہلے اپنی نوآبادی کو غیر مہذب اور ناشائستہ ثابت کرنا ضروری تھا ورنہ White man's bardon کا نعرہ بے حقیقت ہو جاتا۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک کو شائستہ و مہذب بنانے کی ذمہ داری، اپنے پس منظر میں اس ملک کے باشندوں کو حقیقتاً اجڈ اور وحشی بنانے کے تمام نفسیاتی اور علمی ہتھکنڈوں کی داستان چھپائے ہوئے ہے۔ نوآبادکار کے اس ''عظیم بوجھ'' اٹھانے کے احسان نے اہلِ مشرق کی اخلاقیات کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ حالیؔ اس عہد کے ان لوگوں میں سے تھے جو نوآبادیاتی ہتھکنڈوں کا اگر واضح علم نہ بھی رکھتے ہوں لیکن اہلِ مغرب کی شائستگی اور مہذب ہونے کی حقیقت سے بہ خوبی آگاہ تھے، جس کا اظہار ان کے ایک

قطعے ''شائستہ لوگوں کا برتاؤ سائل کے ساتھ'' میں ہوتا ہے یہ قطعہ کئی حوالوں سے اہم ہے۔ حالی نے قانون و انصاف کی جانب دارانہ صورتِ حال کے حوالے سے بھی قطعے کہے ہیں۔ اِسی صورتِحال کے حوالے سے ششی تھرور لکھتے ہیں:

> ''برطانوی ہند میں انصاف بالکل بھی اندھا نہیں تھا؛ یہ مدعا علیہ کی جلد کے رنگ بارے بہت چوکس تھا ہندوستانیوں کے خلاف گوروں کے کیے گئے جرائم پر کم سے کم سزا دی جاتی۔ ایک انگریز جس نے اپنے نوکر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا، کو چھے ماہ قید اور معمولی جرمانہ (اس وقت تقریباً سو روپے) کی سزا دی گئی۔[7]'' آگے وہ مزید لکھتے ہیں کہ انگریز کے ہاتھوں ہندوستانی کی موت ہمیشہ ایکسیڈنٹ ہوتی جبکہ انگریزوں کے خلاف ایسے کسی جرم پر ہندوستانیوں کو سخت ترین سزائیں دی جاتیں۔ بہت سے ایسے کیس عدالتوں میں آئے کہ کسی انگریز آقا کے لات مارنے سے ملازموں کے پیٹ کی تلیاں پھٹ جاتیں اور ان کی موت واقع ہو جاتی۔ اس پر ظلم یہ کہ اس طرح کا سوال اٹھایا گیا کہ کیا اس طرح مہلک لات مارنا قتل کے زمرے میں آتا ہے یا پھر غفلتِ مجرمانہ کے؟ لیکن ظاہر ہے ایسے کمتر ملازموں کی موت پر عظیم نوآبادکار کو کیسے مجرم ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ لہٰذا رابرٹ آگسٹس کے ایسے عمل پر اس کو محض پندرہ دن قید کاٹنے یا پھر بیوہ کو تیس روپے جرمانہ ادا کرنے، کی سزا سنائی گئی۔''[8]

اسی پس منظر میں حالیؔ کا ایک اور قطعہ ''کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان'' ان حالات پر طنز ہے کہ جس میں ایک گورا اور کالا ملازمت سے چھٹی کے لیے میڈیکل رپورٹ بنوانے ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ راستے میں دونوں کا کسی بات پر جھگڑا ہوتا ہے اور گورا غصے میں کالے کو پیٹ میں لات مار دیتا ہے اور پھر:

صدمہ پہنچا جس سے تلی کو بہت مسکین کی	آ کے گھوڑے سے لیا سائیس نے اس کو اتار	کلیاتِ حالیؔ ص ۳۴۰
ٹھوک کر کالے کو گورے نے تو لی اپنی راہ	چوٹ کے صدمے سے غش کالے کو آیا چند بار	

دونوں بالا خر ڈاکٹر کی کوٹھی تک پہنچ کر اپنی اپنی بپتا سناتے ہیں۔ یہ سن کر ڈاکٹر گورے کو بیماری کا اور کالے کو صحت کا سرٹیفیکٹ لکھ کر دے دیتا ہے اور اس کی جو وجہ بتاتا ہے وہ نوآبادیاتی جبر، تکبر اور رعونت کو ظاہر

کرتا ہے:

یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مکے سے مرے — کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار — کلیاتِ
اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند — کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جان دار — حالیؔ
ایک کالا پٹ کے جو گورے سے فوراً مرنہ جائے — آئے بابا اس کی بیماری کا کیونکر اعتبار — ص۳۴۱

حالیؔ طنزاً یہاں گورے اور کالے کے الفاظ سے اس ثنویت کو اجاگر کرتے ہیں جو نوآبادکار نے نسلی برتری کی بنیاد پر رکھی تھی۔ اسی نسلی امتیازات کی بنیاد پر بنائے گئے قانون کی حقیقت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ہندوستان پر حکمرانی بغیر قانون کی طاقت ہاتھ میں لیے ناممکن تھی۔ اسی بنا پر نوآبادکار کو قانون سازی کرنی پڑی۔ جس طرح اس نے اپنی تہذیبی برتری کے لیے یہاں کی تہذیب کو ختم کیا اور اپنی زبان کو بڑا کرنے کے لیے یہاں کی زبانوں کو ختم کیا، بالکل اسی طرح یہاں کے قانون کو زائد المیعاد اور غیر منطقی قرار دیتے ہوئے نوآبادکار کو اپنا قانون لانا پڑا۔ اگرچہ ایسا اسے اپنے استعماری مقاصد کو حصول کے لیے کرنا پڑا لیکن اس نے دہرا فائدہ اٹھایا۔ ایک تو اپنی مرضی کے ایکٹ بنا کر استعمار زدوں کو ہراساں کیا، گورے اور کالے کے فرق کو مزید واضح کیا اور دوسرا یہ کہ اپنے اس بیانیے سے کہ برطانیہ نے ہندوستان کو سیاسی وحدت اور حقیقی جمہوریت دینے کے لیے قانون سازی کی، ہندوستانیوں کو ممنونِ احسان بھی رکھا۔ حالیؔ اس وقت ''قانون'' قطعے میں واضح کرتے ہیں کہ اس قانون کی حیثیت مکڑی کے جالے جیسی ہے جس میں کمزور پھنس جاتے ہیں اور طاقتور اسے توڑ دیتے ہیں۔

حق میں کمزوروں کے ہے قانون — اور نظر میں زور مندوں کی ہے ''لا'' — کلیاتِ حالیؔ ص۳۴۱

لفظ ''لا'' کی ذو معنویت ایسا طنز ہے جو خاموش احتجاج سے عبارت ہے۔ اس قانون کی مزید حقیقت پہلے بیان ہو چکی ہے۔ ظلم یہ کہ آزادی کے 75 سال گزرنے کے باوجود بھی ہم انھیں قوانین کو لاگو کیے ہوئے ہیں جس کے بارے میں ششی تھرور لکھتے ہیں کہ لارڈ میکالے تین سال تک یہ قانون سازی کرتا رہا۔ جن کے لیے قانون سازی کر رہا تھا، دور اونچی دیواروں کے پیچھے وہ ان لوگوں سے چھپ کر اس نے یہ کام کیا۔ اس کے پیشِ نظر نوآبادیاتی مقاصد تھے۔ ۱۸۳۷ء میں میکالے نے یہ تعزیراتی قانون مکمل کیا جس میں انگلستان کے

قوانین کا شائبہ تک نہ تھا۔ ایسا مبہم قانون کہ جس کو برطانوی نوآبادکار چوبیس برس تک پاس نہ کر سکے۔ آخر کار ۱۸۶۱ء میں یہ وضع کیا گیا اور ابھی تک پوری وکٹورین آب و تاب سے جاری ہے۔[9] یہی وجہ ہے کہ آج بھی یہ قانون اسی انداز میں غریب کے لیے فولاد اور امیر کے لیے بریشم کی طرح نرم ہے۔ مزید یہ کہ اس پر بات کرنا آج بھی اتنا ہی بڑا جرم ہے جتنا نوآبادیاتی عہد میں تھا۔ اس لیے تو اصغر ندیم سید نے ''۱۴ اگست کا سفر'' نظم میں کہا تھا: مسافر ساٹھ برسوں کے ابھی تک گھر نہیں پہنچے۔

حوالہ جات

1 محمد راشد سعیدی، ''غالب کے ایک شعر کی قاری اساس تنقید''، مشمولہ: امتزاج (کراچی: شعبہ اردو، جامعہ کراچی، ۲۰۲۱ء) ص ۷۰۔

2 جاوید اختر، بھٹی، (مرتب)، برصغیر میں اردو صحافت کا آغاز (ملتان: الکتاب گرافکس، ۲۰۲۱ء)، ص ۱۰۶۔

3 ششی تھرور، عہدِ ظلمات، مترجمہ: عابد محمود (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۲۱ء)، ص ۲۰۹۔

4 جیلانی کامران، غالب: ایک تہذیبی شخصیت (راولپنڈی: خالد اکیڈمی، ۱۹۷۲ء)، ص ۱: ۲۔

5 محمد امین زبیری، ۱۸۵۷ء کے تاریخی، علمی اور ادبی پہلو، مرتبہ: محمد اکرام چغتائی (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء)، ص ۲۳۔

6 فرنٹز فینن، افتادگانِ خاک، مترجمہ: سجاد باقر، محمد پرویز (کوئٹہ: گوشۂ ادب، س۔ن)، ص ۳۳۔

7 ششی تھرور، عہدِ ظلمات، ص ۱۱۰۔

8 ایضاً

9 ایضاً

نوٹ: حالیؔ کے تمام قطعات ''تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، ''کلیاتِ حالیؔ''، مرتبہ، (جہلم، بک کارنر، حالیؔ کی صد سالہ برسی کے موقع پر ۲۰۱۶ء)، ص ۳۷۰'' میں سے لیے گئے ہیں۔ جن کے صفحات کی ترتیب یوں ہے: ۳۷۰۔۳۵۱۔۳۴۸۔۳۶۸۔۳۳۳۔۳۵۳۔۳۳۳۔۳۴۸۔۳۳۸۔۳۷۲۔۳۷۰۔۳۳۹۔۳۴۰